# نیکی کی تحریک پر فوراً عمل کرو

از

سیدنا حضرت میرزا بشیر الدین محمود احمد
خلیفۃ المسیح الثانی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

# نیکی کی تحریک پر فوراً عمل کرو

(فرمودہ ۷؍مئی ۱۹۴۷ء بعد نماز مغرب بمقام قادیان)

انسانی قلب کی حالت اور انسانی مقدرتیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ ایک وقت انسان پر ایسا آتا ہے کہ اس کے اندر قبض کی حالت پیدا ہو جاتی ہے اور ایک وقت اُس پر ایسا آتا ہے کہ اس پر بسط کی حالت ہوتی ہے اور یہ قبض اور بسط کی حالتوں کے دَور بدلتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یہ حالتیں الٰہی حکمت اور تدبیر کے ماتحت آتی ہیں اور بعض اوقات انسان ان حالتوں کو خود اپنے اوپر وارد کر لیتا ہے اور یہ اس کے اپنے پیدا کئے ہوئے ماحول کے مطابق ہوتی ہیں۔ خدا تعالیٰ نے انسان کے دماغ کو حساس بنایا ہے اور وہ خوف اور محبت کے جذبات کو اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتا ہے کہ اس کے ذرہ ذرہ میں بجلی کی سی لہر دَوڑ جاتی ہے اور یہ دونوں جذبات اُس کے اندر ایسے مدغم ہو جاتے ہیں اور ان جذبات کی اتنی شدت ہوتی ہے کہ بعض اوقات تو وہ غم کو برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے اور بعض اوقات شادیٔ مرگ ہونے کی وجہ سے مر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسا بنا دیا ہے کہ اس پر کوئی حالت بھی دائمی نہیں رہ سکتی کبھی وہ غم کے دَور میں سے گزر رہا ہوتا ہے اور کبھی خوشی اور محبت کے دَور میں سے۔ اگر انسان کی ان حالتوں میں تغیر اور انقلاب نہ ہوتا رہے تو وہ ان دونوں قسم کے جذبات میں سے کسی ایک شدت کو بھی برداشت نہیں کر سکتا۔ شدتِ غم بھی ہلاکت کا موجب ہوتی ہے اور شدتِ خوشی بھی موت کا موجب۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صحابی آئے اور انہوں نے بے اختیار رو کر عرض کیا کہ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! میں تو منافق ہوں آپ نے فرمایا کس طرح؟ تم تو مؤمن ہو۔ صحابی نے عرض کیا یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ! جب میں آپ کی مجلس میں ہوتا ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ

میرے ایک طرف جنت ہے اور دوسری طرف دوزخ اور میں جب بھی کوئی ارادہ کرتا ہوں تو چونکہ میں جنت اور دوزخ دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہوں اس لئے میرا ارادہ ہمیشہ نیکی کی طرف جاتا ہے اور آپ کی مجلس میں بیٹھے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میرے سامنے سے تمام حجاب اٹھ گئے ہیں اور میں وراء الوراء دنیا کا مشاہدہ کر رہا ہوں لیکن جب میں آپ کی مجلس سے واپس جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں رہتی نہ مجھے جنت نظر آتی ہے اور نہ دوزخ اس لئے یَا رَسُوْلَ اللّٰہ! میں اپنے آپ کو منافق سمجھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا یہ تو منافقت کی علامت نہیں اگر تم پر ہر وقت یہی حالت طاری رہے تو تم مر جاؤ[1] پس اللہ تعالیٰ نے انسانی قلب کو اس طرح بنایا ہے کہ اس پر مختلف دَور آتے رہتے ہیں کبھی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ جب وہ خدا تعالیٰ کی رحمتوں کے متعلق غور کر رہا ہوتا ہے اور اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہتا ہے تو اس کے دل میں خیال آتا ہے کہ تمام تعریفوں کے لائق صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اُس کے سِوا اور کسی کی پرستش یا کسی سے مدد مانگنا درست نہیں ہے۔ پھر جب وہ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہتا ہے تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے تمام جہانوں کا پالنے والا صرف خدا ہی ہے جب وہ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کہتا ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بن مانگے دینے والا اور سچی محنتوں کو ضائع کرنے والا نہیں، جب وہ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کہتا ہے تو وہ سوچتا ہے کہ اعمال کی جزاء وسزا کے لئے اُسی کے دربار میں حاضر ہونا ہے، جب وہ اِیَّاکَ نَعْبُدُ پر پہنچتا ہے تو اس کے تمام خیالات میں نیکی کی رَو پھیل جاتی ہے اور وہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اے خدا! ہم صرف اور صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور جب وہ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر غور کرتا ہے تو کہہ اُٹھتا ہے کہ اے ہمارے ربّ! بیشک ہم تیری عبادت کرتے ہیں مگر اس کے لئے ہم تیری ہی مدد اور اعانت کے محتاج ہیں۔ اسی طرح جب وہ وَلَا الضَّآلِّیْنَ تک پہنچتا ہے تو وہ نیکی کے تمام مراحل طے کر چکا ہوتا ہے اور نیکی کے جذبات اس پر پوری طرح حاوی ہو جاتے ہیں لیکن وہی شخص جب بازار میں جاتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کسی جگہ آلو فروخت ہو رہے ہیں، کسی جگہ دوسری اجناس فروخت ہو رہی ہیں تو اُس کے دماغ سے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ وغیرہ کے نقوش ہٹ جاتے ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ اگر میں اتنے سیر آلو خرید لوں تو مجھے اس بھاؤ بیچنے میں اتنا نفع ہوگا یا مَیں اتنے

من گندم خرید لوں تو مجھے ایک ماہ کے بعد اتنے نفع کی امید ہوسکتی ہے۔ یا کوئی شخص ملازمت میں ہوتا ہے تو وہ دفتر کی فائلوں کی چھان بین میں گم ہو جاتا ہے یا کوئی پیشہ ور ہوتا ہے تو وہ اپنے کارخانہ میں پہنچ کر اپنے کام میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ نیکی کے جذبات اس کے دماغ سے نکل جاتے ہیں۔ انسانی حالت کے یہ دَور طبعی دَور ہیں۔ گو ان پر خدا تعالیٰ کا قانون حاوی ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر انسان پر چوبیس گھنٹے ایک ہی حالت رہی اور ایک ہی قسم کے جذبات کا دباؤ رہا تو وہ مر جائے گا۔ لیکن ہم اِن اَدوار کا نام طبعی اس لئے رکھتے ہیں کہ یہ انسان کے اپنے پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں اور اس کے اپنے ماحول کی وجہ سے یہ حالتیں اُس پر آتی ہیں کیونکہ جس شخص نے کوئی ملازمت کی ہوئی ہے وہ اس کی اپنی تجویز کردہ ہے اور پیشہ ور کا پیشہ اس کا اپنا اختیار کردہ ہے۔ اسی طرح دُکاندار کی دُکانداری اس کی اپنی پیدا کردہ ہے ان دَوروں میں پڑ کر انسان کبھی تو نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور کبھی بدی کی طرف۔ کوئی شخص ایسا ہوتا ہے کہ وہ نیکی کا دَور پا کر اس سے فائدہ اُٹھاتا ہے اور اس کو غنیمت سمجھتے ہوئے بڑے شوق سے نیکیاں بجا لاتا ہے مگر کوئی ایسا ہوتا ہے جس پر نیکی کا دَور تو بے شک آتا ہے مگر وہ اپنے تساہل کی وجہ سے اس موقع کو ضائع کر دیتا ہے کیونکہ وہ ایسے دَور کے آنے پر یہ سوچنے لگ جاتا ہے کہ ابھی بڑا موقع ہے کر ہی لیں گے۔ پہلے چل کر آٹھ آنے کے آلو لے لوں تا کہ کل بارہ آنے بن سکیں یا اپنا فلاں کام کر لوں بعد میں نیکی کر لوں گا۔ اِس وقت کے گزر جانے پر اس کی نیکی کی حالت بے شک وہی رہے گی مگر حالات بدل جانے کی وجہ سے یہ توفیق اس سے چھن جائے گی۔ مثلاً ایک شخص پر نیکی کا دَور آیا اور اس نے اپنی غفلت اور سُستی سے اُس کو ملتوی کر دیا تو ہوسکتا ہے کہ بعد میں وہ نیکی کی خواہش کے باوجود نیکی نہ کر سکے کیونکہ ممکن ہے کہ اس کی ملازمت جاتی رہے یا اس کی تجارت تباہ ہو جائے۔ پھر بعض انسان ایسے ہوتے ہیں کہ ان پر نیکی کا دَور آتا تو ہے مگر نیکی کرنے سے پہلے ان کی نیت میں فرق آ جاتا ہے اور وہ نیکی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ملک میں ایک لطیفہ مشہور ہے کہتے ہیں کوئی پٹھان ایسے علاقہ میں چلا گیا جہاں کھجوروں کے درخت تھے اس کے اپنے ملک میں تو کھجور ہوتی نہ تھی دوسرے پھل ہوتے تھے اُس نے کسی باغ میں کھجوروں کے درخت اور ان پر کھجوریں پکی ہوئی دیکھیں تو دل میں خیال آیا

کہ یہاں جو کھجوریں کافی ہیں خریدنے کی کیا ضرورت ہے یہیں سے کیوں نہ کھا لوں ۔ یہ سوچ کر وہ باغ کے اندر گھس گیا اور کھجور کے درخت پر چڑھ گیا اور چڑھ کر کھجوریں کھاتا رہا۔ جب سیر ہو گیا تو نیچے اُترنے کا ارادہ کیا مگر مشکل یہ پیش آئی کہ کھجور پر چڑھنا تو آسان ہوتا ہے اُترنا بہت دشوار ہوتا ہے جب اُس نے اُترنے کا ارادہ کیا اور نیچے دیکھا تو ہوش اُڑ گئے کیونکہ زمین بہت دور نظر آتی تھی، کانپنے لگ گیا اور گھبرا کر نیت کی کہ اگر میں صحیح سلامت نیچے اُتر گیا تو خدا کی راہ میں ایک اونٹ قربان کروں گا۔ یہ نیت کر کے آنکھیں بند کر لیں اور اُترنا شروع کر دیا جب وہ تھوڑا سا اُتر چکا آنکھیں کھول کر دیکھا تو زمین پہلے سے ذرا نزدیک نظر آئی۔ اِس پر دل میں کہنے لگا میں نے اونٹ کی قربانی کا وعدہ کرنے میں سخت غلطی سے کام لیا ہے اور اونٹ کی قربانی ہے بھی بہت زیادہ اس لئے میں قربانی تو ضرور دوں گا لیکن اونٹ کی بجائے گائے کی قربانی دوں گا۔ یہ کہہ کر پھر آنکھیں بند کیں اور اُترنا شروع کیا۔ تھوڑا اور اُتر کر نیچے دیکھا تو زمین اور بھی نزدیک نظر آئی کہنے لگا بات یہ ہے کہ گائے کی قربانی بھی زیادہ ہے اس لئے گائے تو نہیں بکری ضرور دوں گا۔ یہ کہہ کر تھوڑا اور نیچے اُترا، اب وہ دو تہائی کے قریب اُتر چکا تھا اس نے نیچے دیکھا جب زمین بالکل قریب نظر آئی تو ڈھارس بندگئی اور کہنے لگا دراصل اتنی سی بات کے لئے بکری کی قربانی بھی زیادہ ہے اِس لئے میں بکری تو نہیں مرغی ضرور دوں گا یہ کہہ کر پھر اُترنا شروع کیا تھوڑا اُتر کر جو نیچے دیکھا تو معلوم ہوا کہ اب زمین تو ایک چوتھائی سے بھی کم رہ گئی ہے اُس نے اطمینان کا سانس لیا اور کہنے لگا بھلا اتنی سی بات کے لئے کوئی مرغی قربان کرتا پھرتا ہے۔ قربانی ہی کرنا ہے تو ایک انڈا کافی ہے یہ کہہ کر پھر اُترنے لگا اور جب اُس کے قدم زمین پر آ لگے تو اسے انڈے کی قربانی بھی بوجھل معلوم ہوئی۔ سرحد کے پٹھان قصبات میں نہیں رہتے بلکہ پہاڑوں کے اندر ان کے جھونپڑے ہوتے ہیں اور چونکہ پانی کی قلت ہوتی ہے اس لئے ایک دفعہ جو شلوار پہنی گئی تو وہ اُس وقت اُترتی ہے جب اُس کا تانا بانا الگ الگ ہو جاتا ہے اور جوؤں کی اتنی کثرت ہوتی ہے کہ شلوار کے اندر سر کے بالوں سے بھی ان کی آبادی گنجان ہوتی ہے چنانچہ پٹھان نے اپنے نیفے سے ایک جوں نکالی اور مار کر کہنے لگا جان کے بدلے جان چلو قربانی ہوگئی۔

یہ لطیفہ ہے تو احمقانہ مگر اِس کے اندر ایک حد تک صداقت بھی موجود ہے اور وہ اس طرح کہ ایک وقت انسان پر ایسا آتا ہے کہ وہ اونٹ قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن کوئی وقت ایسا بھی آتا ہے کہ وہ جوں بھی قربان نہیں کرسکتا۔ یہ دَور کم و بیش ہر انسان پر ضرور آتے ہیں اور شاید ہی کوئی انسان ہو جو ان حالتوں میں سے نہ گزرا ہو۔ ایک وقت انسان حیرت انگیز قربانی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے مگر دوسرے وقت ایک پیسہ بھی خدا کی راہ میں خرچ کرنا دوبھر سمجھتا ہے اور کبھی انسان کے حالات میں ایسا تغیر آجاتا ہے کہ اُسے قربانی کرنے کی توفیق ہی نہیں رہتی۔ مثلاً ایک شخص کے پاس سَو روپیہ موجود ہے اور اس کے دل میں نیکی کا ارادہ بھی ہے مگر وہ اپنے دل میں کہتا ہے چلو پھر نیکی کر لوں گا اِس وقت فلاں سَودا کرلوں مگر بعد میں اُس پر ایسا وقت آتا ہے کہ چاہے وہ نیکی کرنا چاہے اُس کے حالات اِس قسم کے ہوتے ہیں کہ وہ نیکی کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ پہلی مثال تو دل کی کیفیات بدلنے کی تھی مگر یہ مثال حالات بدلنے کی ہے کہ اس نے نیکی کے موقع کو ضائع کر دیا اور التواء ہو جانے سے اُس کے حالات بدل گئے اور وہ مفلس اور کنگال ہو گیا۔ اُسے چاہئے تھا کہ جب اس پر نیکی کا دَور آیا تھا اُسے قبول کرتا اور اُس سے فائدہ اُٹھاتا اور دُور اندیشی سے کام لیتے ہوئے اِس بات کو سوچتا کہ ممکن ہے کہ کل یہ دَور بدل جائے اور میرے اندر نیکی کرنے کی استعداد نہ رہے۔ پھر بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے قلوب میں نیکی تو ہوتی ہے مگر وہ اپنے خیالات کے ماتحت کھجور سے اُترنے والے پٹھان کی طرح اُس کے دَور کو توجیہات سے ملا دیتے ہیں مگر مؤمن کا کام ہے کہ جب اس کو نیکی کا دَور ملے وہ اس سے جتنی جلد ہو سکے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرے تا کہ التواء ہونے کی وجہ سے نیکی سے محروم نہ رہ جائے۔ مؤمن کی یہ حالت ہوتی ہے کہ بسا اوقات وہ اپنے حالات کے ماتحت ایک ادنیٰ نیکی کا ارادہ کرتا ہے مگر بعد میں اس کے حالات بدل جاتے ہیں اور اُسے اعلیٰ نیکی کی توفیق مل جاتی ہے تو وہ اعلیٰ قسم کی نیکی کرتا ہے اور جس نیکی کا اس نے پہلے ارادہ کیا تھا اُس کو ادنیٰ ہونے کی وجہ سے ترک کر دیتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جب غزوہ تبوک ہوا تو اُس وقت یہ خبر مشہور ہوئی تھی کہ قیصر کی فوجیں جمع ہو رہی ہیں جو مدینہ پر حملہ کریں گی۔ اُس وقت یہ حالت تھی کہ ایک طرف شاہی لشکر تھا اور دوسری طرف مؤمنین کی ایک چھوٹی سی جماعت۔ گویا جسمانی اور ظاہری

طاقت کے لحاظ سے مدینہ کو قیصر کی فوجوں سے کوئی نسبت ہی نہ تھی اور روحانی لحاظ سے قیصر کی فوجوں کو مدینہ سے کوئی نسبت نہ تھی۔ اُس زمانہ میں قیصر کی سلطنت بہت وسیع تھی اور یورپ سے ایران تک کا سارا علاقہ اس کے ماتحت تھا۔ ادھر افریقہ میں ایبے سینیا اور مصر وغیرہ اس کے باج گزار[۲] تھے اور قیصر کی اپنی فوجیں تو الگ رہیں اس کے ماتحتوں کے پاس بھی چالیس چالیس، پچاس پچاس ہزار فوج تھی اور سامانِ جنگ بھی بہت زیادہ تعداد میں تھا۔ اِدھر مسلمانوں کی فوج کو کیا بلحاظ تعداد اور کیا بلحاظ سامانِ جنگ ان فوجوں سے کوئی نسبت نہ تھی۔ قیصر کے مدینہ پر حملہ کی خبر سن کر کمزور مسلمان تو ڈر رہے تھے لیکن مؤمن اپنے دلوں میں یہ کہہ رہے تھے کہ اِس خطرے کے وقت جو قربانیاں کرنے کا مزہ آئے گا وہ اور کہاں آ سکتا ہے اسی موقع پر حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ بھی ہجرت کر کے پا پیادہ جوشِ ایمان کی وجہ سے آ گئے تھے ان کے پاس نہ سواری تھی اور نہ دولت وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! ہمیں بھی ثواب کا موقع مل جائے ہم بھی جنگ میں شامل ہونا چاہتے ہیں لیکن ہمارے پاس تو سواریاں نہیں اس لئے ہمیں کوئی چیز دی جائے جس کے ذریعہ آسانی کے ساتھ ہم سفر کر سکیں۔ ان کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے سواری ہی مانگی تھی لیکن بعد میں جب کسی شخص نے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے اس کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے کہا کہ ہم نے سواری نہیں بلکہ چپلیاں مانگی تھیں تا کہ ہم سنگلاخ راستوں پر سفر کر سکیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انہوں نے مانگی تو چپلیں ہوں لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سمجھا ہو کہ یہ سواری مانگ رہے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے انہوں نے سواری ہی مانگی ہو مگر ان کے ذہن میں جو اقل ترین مطالبہ ہو وہ چپلوں ہی کا ہو۔ غرض اُنہوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمیں سفر کی سہولت کے لئے کوئی چیز دی جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی سواری نہ تھی۔ آپ نے فرمایا میرے پاس سواری کا کوئی انتظام نہیں انہوں نے پھر اصرار کیا مگر آپ نے فرمایا کہ میرے پاس کوئی سواری نہیں۔ اُنہوں نے پھر عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! ہمیں کیوں ثواب سے محروم کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا میرے پاس سواری ہے ہی نہیں تو دوں کہاں سے مگر انہوں نے پھر بھی اصرار کیا اور کہا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! آپ تو بادشاہ ہیں بھلا آپ کے

پاس سواری کیوں نہ ہوگی۔ آپ نے جب دیکھا کہ یہ ٹلنے والے نہیں ہیں تو فرمایا خدا کی قسم! میں تمہیں سواری نہیں دوں گا۔ اِس پر ابوموسیٰ اشعریؓ مایوس ہو کر واپس آ گئے مگر تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ کسی مخلص نے لڑائی کے لئے دو اونٹ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کئے اور عرض کیا کہ کئی ایسے مسلمان ہیں جن کے پاس سواریاں نہیں ہیں ایسے آدمیوں کو یہ اونٹ دے دیں۔ آپ نے پھر ابوموسیٰ اشعری اور ان کے ساتھیوں کو بُلایا اور وہ دونوں اونٹ انہیں دے کر فرمایا باری باری سے ان پر سوار ہوتے جانا۔ وہ اونٹ لے کر چلے گئے مگر تھوڑی دیر کے بعد انہیں خیال آیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قسم کھائی تھی کہ میں تمہیں سواری نہیں دوں گا اور اب دے دی ہے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بُھول گئے ہیں اور آپ کی قسم ٹوٹ گئی ہے اور اگر آپ کی بھول سے ہم نے فائدہ اُٹھایا تو ہمارا انجام خراب ہوگا اس لئے ہمیں سواریاں واپس کرنی چاہئیں۔ چنانچہ وہ واپس آپ کے پاس آئے اور عرض کیا یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ! آپ نے قسم کھائی تھی کہ مَیں تمہیں سواری نہیں دوں گا مگر اب آپ نے دے دی ہے اِس لئے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بھول گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے قسم تو یاد ہے مگر بات یہ ہے کہ میں قسم کھاؤں یا قسم کے بغیر کوئی ارادہ کروں جب زیادہ ثواب کا موقع آ جائے تو مَیں اپنے ارادہ میں تبدیلی کر لیتا ہوں میں اپنی قسم کی وجہ سے کسی کو ثواب سے محروم نہیں کرنا چاہتا میں جب کوئی ارادہ کرتا ہوں تو جب اس سے زیادہ بہتر ارادہ میرے دل میں آ جائے تو اُسی پر عمل کرتا ہوں کیونکہ اصل غرض تو نیکی ہے جب زائد نیکی کا موقع مل جائے تو اُس کو ضائع نہیں کرنا چاہئے۔[۳]

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آپ کے پاس سواری تھی ہی نہیں تو آپ نے یہ قسم کیوں کھائی کہ خدا کی قسم! میں تمہیں سواری نہیں دوں گا۔ قرآن کریم، احادیث اور تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت آپ کے پاس سواری تھی ہی نہیں اور قسم کے معنی یہ ہیں کہ کوئی چیز موجود ہو اور دینے سے انکار کر دیا جائے۔ اب کیا کوئی یہ قسم کھا سکتا ہے کہ میں چاند کے پاس نہیں جاؤں گا یا میں سورج کے پاس نہیں جاؤں گا یا کوئی یہ قسم کھاتا ہے کہ مَیں ایک ہی دفعہ ہاتھی نہیں نگلوں گا۔ اسی طرح سوال یہ ہے کہ جب آپ کے پاس سواری ہی نہ تھی تو آپ نے قسم کیوں کھائی؟ اِس کا جواب یہ ہے کہ غیر متمدن اور غیر مہذب لوگ دوسرے کی بات کا اعتبار

نہیں کرتے جب تک قسم نہ کھائی جائے۔ ہمارے پاس بعض اوقات ایسے لوگ آتے رہتے ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمارا فلاں کام کرادیں۔ ہم کہتے ہیں یہ کام ہم نہیں کر سکتے۔ وہ کہتے ہیں آپ سب کچھ کر سکتے ہیں گویا ہم کام تو کر سکتے ہیں مگر جھوٹ بولتے ہیں کہ ہم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح وہ لوگ بھی غیر متمدن اور غیر مہذب تھے وہ نئے نئے آئے تھے اور اُن کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت، وقار، عظمت اور اعلیٰ اخلاق کا پتہ نہ تھا جب آپ نے اُن سے فرمایا کہ میرے پاس سواری نہیں ہے تو انہوں نے سمجھا کہ سواری تو ہے مگر آپ انکار کر رہے ہیں اس لئے اصرار کیا کہ آپ تو بادشاہ ہیں آپ کے پاس سواریاں کیوں نہ ہوں گی۔ مزید یہ کہ عرب لوگوں کی عادت ہے کہ ان کی کسی بات پر تسلی نہیں ہوسکتی جب تک قسم نہ کھائی جائے معمولی معمولی باتوں پر وہ وَاللّٰہِ بِاللّٰہِ ثُمَّ تَاللّٰہِ کہتے رہتے ہیں اس لئے ان کے سواری مانگنے کے اصرار کا ایک ہی جواب تھا کہ آپ قسم کھاتے۔ چونکہ ان لوگوں نے آپ کے جواب کو عُذر اور بہانہ سمجھا تھا اس لئے آپ نے اُن کی تسلی کے لئے اور پیچھا چھڑانے کے لئے قسم کھائی وہ چلے گئے تو سواری بھی آ گئی اور آپ نے دوبارہ ان کو بُلا کر سواری دے دی۔ پس وہ قسم اس لئے تھی کہ میرا وقت ضائع نہ کرو اور اصرار نہ کرو اور سواری آپ نے اس لئے دی کہ یہ نیکی کا موقع تھا اور آپ اُس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

پس جب کسی انسان کے دل میں نیکی کرنے کا ارادہ پیدا ہو تو اس کو ضائع نہیں کرنا چاہئے بلکہ اس سے فائدہ اُٹھانا چاہئے کیونکہ ممکن ہے وہ موقع گزر جائے اور پھر توفیق نہ مل سکے۔ پس میں دوستوں کو نصیحت کرتا ہوں کہ جب نیکی کا دَور تم پر آئے تو اس سے فائدہ اُٹھاؤ جب تم نیکی کے ایک دَور سے فائدہ اُٹھاؤ گے تو تمہارے لئے نیکی کا اگلا دَور بہت سہل ہو جائے گا۔

(الفضل ۱۷؍ مارچ ۱۹۶۵ء)

---

۱ مسلم کتاب التوبۃ۔ باب فضل دوام الذکر و الفکر فی امور الآخرۃ...... (الخ)

۲ **باج گزار:** ریاست کو محصول دینے والا، خراج گزار، مطیع

۳ بخاری کتاب الایمان والنذور باب قول اللّٰہ تعالیٰ لایؤاخذکم اللّٰہ باللغو فی ایمانکم